حضرت مولانا حافظ محمد صاحب گوندلوی

قسط نمبر ۱۶

دوام حدیث

حفاظتِ حدیث

شروطِ صحّتِ روایت

آٹھویں وجہ جس سے دین محفوظ رہا اور حدیثیں یاد رہیں اور ردوبدل سے بچی رہیں یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے لوگوں کے دلوں میں شوق پیدا کر دیا کہ صحیح وضعیف، منکر و موضوع اور موقوف و مرفوع میں امتیاز کرنے کے لیے انہوں نے زندگیاں وقف کر دیں اور اس قسم کے قواعد قرآن مجید سے استنباط کیے کہ احادیث میں ان کا لحاظ کرنے کے بعد دین میں کوئی غلط چیز داخل نہیں ہو سکتی۔ ان قواعد کے صحیح استعمال کرنے کے بعد ایک صحیح الدماغ کو یقین حاصل ہو جاتا ہے کہ یہ صحیح حدیثیں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ہی فرمان یا عمل یا تقریر ہیں صرف وہی لوگ یقین سے محروم رہتے ہیں جن پر وہم غالب ہوا۔ ان کا دماغ اتنا بلند نہیں ہوتا کہ ان میں قواعد مذکورہ سے یقین پیدا ہو سکے۔ نہ اتنی ذہنی صفائی رکھتے ہیں کہ وہم وشک کی دلدل سے نکل سکیں۔ بعض طبیعتیں اس قسم کی ہوتی ہیں کہ یقینی باتیں ان کے دل کو مطمئن نہیں کر سکتیں۔ ان کو سوفسطائی کہتے ہیں۔ یقینی اور وہمی باتوں میں امتیاز کرنا ان کے بس میں نہیں ہوتا۔ ایسے لوگ معذور ہونے کی بنا پر ہمارے مخاطب نہیں ہیں۔

نقلی بات اگر بلا واسطہ ہم تک نہ پہنچے

تو لامحالہ کسی واسطے کے ذریعہ ہی پہنچے گی۔ اگر واسطے پر ہم مطمئن ہوں تو اس بات پر بھی مطمئن ہو جائیں گے جو اس واسطے کے ذریعہ پہنچی ہو۔ مثلاً ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک بات نقل کرنی چاہتے ہیں۔ اس کی دو ہی صورتیں ہیں:-

(۱) ہم نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہو اور ہم کو یقین ہو کہ بھولے نہیں تو اس صورت میں ہم اس بات کے ثبوت کے متعلق اپنے آپ کو مطمئن پاتے ہیں۔

(۲) اگر ہم کو یہ اتفاق نہیں ہوا تو لا محالہ بذریعہ واسطے کے ہی ہم آپؐ کی بات معلوم کر سکتے ہیں۔ اگر ہم کو واسطے پر اطمینان ہو تو پھر بھی ہم اس نقل کردہ بات پر مطمئن ہو سکتے ہیں۔ اگر ایک واسطے سے زیادہ دو واسطے یا تین یا زیادہ ہوں تو ہم کو منقول بات پر اطمینان کرنے کے لیے ضروری ہے کہ ہم ان تمام واسطوں کے متعلق اطمینان حاصل کر لیں۔

اطمینان حاصل کرنے کے لیے واسطے میں کتنی باتوں میں غور کرنا ہوتا ہے؟

نقل کرنے والے کے متعلق دو باتیں معلوم کرنا ضروری ہیں :-

۱۔ حافظہ کا قوی ہونا۔

۲۔ دیانت دار ہونا

اگر واسطے زیادہ ہوں تو سند میں تسلسل کا جاننا بھی ضروری ہے۔ ایسا نہ ہو کہ کہیں درمیان میں واسطے کم ہو گئے ہوں۔ اگر کسی منقول کلام میں مندرجہ بالا باتیں پائی جائیں تو اس میں پانچ شرطیں پائی جائیں گی۔

(۱) نقل کرنے والوں کا حافظہ اچھا ہو۔

(۲) دیانت دار ہوں (ثقہ ہوں)

(۳) درمیانی کوئی واسطہ گم نہ ہو یعنی ایک دوسرے سے سنا ہو۔

(۴) غلطی کی وجہ سے کوئی راوی رہ نہ گیا ہو۔

(۵) یہ کلام جو اس سند کے ساتھ آیا ہے دوسرے معتبر راویوں کے خلاف نہ ہو۔

ان تمام شرائط کا یہ مطلب ہے کہ راوی معتبر ہوں اور سند کی تسلسل قائم رہے۔ متن میں غلطی نہ ہو۔ کیونکہ بعض وقت ایک معتبر آدمی بھی غلطی کر جاتا ہے۔ جب مذکورہ بالا باتوں کا اطمینان ہو جائے تو اس وقت اس کو حدیث صحیح کہتے ہیں۔ اگر اس حدیث کی صحت پر محدثین کا اتفاق ہو تو اس وقت اس حدیث کی صحت یقینی ہو جاتی ہے، کیونکہ اہل فن کے اجماع سے غلطی کا احتمال اٹھ جاتا ہے صحت کے یقینی ہونے کے بعد وہ صحت بلحاظ ثبوت اور صداقت مضمون کے لحاظ سے

یقینی ہو جاتی ہے۔

اس کی مثال سنیئے

میں اسٹیشن پر گیا۔ گوجرانوالہ اسٹیشن پہ مجھے ایک آدمی ملا جو لاہور سے آیا ہے۔ اس نے مجھے کہا کہ آج لاہور بارش ہوئی ہے ——————— یا مجھے ایک آدمی ملا جو اسٹیشن گوجرانوالہ سے یہ سن کر آیا ہے کہ لاہور میں بارش ہوئی ہے۔

اب ظاہر ہے کہ اگر مجھے دو آدمیوں پر اعتماد ہو تو مجھے اس خبر پر بھی اطمینان ہو جائے گا اور پہلی صورت میں اگر مجھے ایک آدمی پر اطمینان ہو تو مجھے اس کی خبر پر بھی اطمینان ہو گا۔ ان پر اطمینان اسی صورت میں ہو گا جب میں ان کے حافظہ اور دیانت کو قابلِ اعتماد سمجھوں۔

اگر اس خبر کے درست ہونے پر سب لاہور سے آنے والے اور ان سے سننے والے متفق ہو جائیں تو اس خبر کی صحت یقینی ہو گی۔ اگر یہ دونوں سب کے ہاں قابلِ اطمینان نہ ہوں تو پھر بحث کی گنجائش نکل آئے گی۔

اور یہ سب شرائط جن کا اوپر ذکر ہوا اور محدثین نے حدیث کی صحت جانچنے کے لیے ان کو لیا ہے۔ قرآن مجید سے ماخوذ ہیں۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنْ جَآءَكُمْ فَاسِقٌۢ بِنَبَاٍ فَتَبَيَّنُوْٓا اَنْ تُصِيْبُوْا قَوْمًاۢ بِجَهَالَةٍ فَتُصْبِحُوْا عَلٰى مَا فَعَلْتُمْ نٰدِمِيْنَ ۝ [1]

اے ایماندارو! اگر تمہارے پاس کوئی فاسق خبر لائے تو اس کی تحقیق کر لیا کرو ایسا نہ ہو کہ تم نادانی سے کسی قوم کو تکلیف پہنچاؤ پھر اپنے کیے پر ندامت اٹھاؤ۔

اس آیت سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ فاسق کی خبر پر اس لیے اعتماد نہیں کیا جاتا کہ اس کی خبر سے علم حاصل نہیں ہوتا۔ انسان جہالت ہی میں رہتا ہے۔ اس آیت کا مفہوم یہ ہوا کہ اگر کوئی قابلِ اطمینان شخص خبر دے تو اس پر اعتماد کرنا چاہیے۔ کیوں کہ قابلِ اطمینان کی خبر سے جہالت اٹھ جاتی ہے اور علم حاصل ہو جاتا ہے۔

---

[1] سورۃ الحجرات

محدثین کرام کی تمام شرائط کا مرجع بھی حصول علم ہے۔

- پہلی شرط حافظہ کا اچھا ہونا ہے اگر یہ شرط نہ پائی جائے تو خطرہ ہوتا ہے کہ راوی بھول نہ گیا ہو اس سے علم میں خلل آجاتا ہے۔
- دوسری شرط دیانت دار ہو۔ اگر یہ بھی نہ ہو تو پھر خطرہ ہوتا ہے کہ راوی نے خبر میں کہیں بددیانتی سے کمی وبیشی نہ کی ہے۔
- تیسری شرط درمیانی واسطہ گم نہ ہو۔ کیونکہ گم ہونے کی صورت میں کیا پتہ کہ واسطہ فاسق ہے یا عادل اور پہلی صورت میں جہالت بدستور قائم رہتی ہے۔ اس کی خبر سے علم حاصل نہیں ہوتا۔
- چوتھی شرط یہ ہے کہ بظاہر تو واسطہ گم نہیں کیونکہ جتنے راوی ہیں وہ ایک دوسرے کے شاگرد ہیں مگر یہ روایت بخصوصہ راوی نے اپنے استاذ سے نہیں سنی اور غلطی سے واسطہ چھوڑ دیا ہے۔ ایسا بھی نہ ہو۔ اگر ایسا ہو گا تو پھر بھی علم حاصل نہیں ہو گا۔
- پانچویں شرط کہ متن دوسرے راویوں کے بیان کے مطابق ہو۔ کیونکہ اگر مخالف ہو گا تو پھر اکثریت یا قوی حافظہ والے کو ترجیح ہو گی۔ اختلاف کی بنا پر اس کی روایت سے علم حاصل نہیں ہو گا۔

ان پانچ شرائط کا علم دیکھنے یا سننے سے حاصل ہوتا ہے۔

ہم ایک آدمی کے پاس پڑھتے ہیں۔ روزمرہ ان کے حافظہ اور دیانت داری کا ملاحظہ کرتے ہیں۔ اگر ہماری نظر غائر اور فراست تامہ ہو تو ہم کو اپنے استاذ کے متعلق رائے قائم کرنے میں اطمینان حاصل ہوتا ہے۔ اگر ہمارا استاد دیانت دار اور حافظہ میں قابل اطمینان ہو تو کوئی وجہ نہیں کہ اس کی شہادت اس کے استاد کے متعلق صحیح نہ سمجھی جائے۔ اگرچہ غلطی کا احتمال ہے مگر مجرد احتمال کی وجہ سے ہمارے اطمینان میں کوئی کمی پیدا نہیں ہوتی جب تک اس احتمال پر کوئی دلیل نہ پائی جائے اگر ایک شہادت کی جگہ زیادہ شہادتیں میسر آجائیں تو یقین تک نوبت پہنچ سکتی ہے۔

مثلاً میں نے حدیث کا کچھ حصہ مولوی عبد الجبار صاحب غزنوی سے اور کچھ آنجناب کے بیٹے مولوی مولوی عبد الاول صاحب سے اور کچھ حصہ مولانا مولوی عبد الغفور صاحب سے پڑھا اور ان تمام نے سید نذیر حسین صاحب دہلوی سے سند حاصل کی اور جناب سید نذیر حسین صاحب

نے شاہ اسحاق صاحب سے اور شاہ اسحاق صاحب نے شاہ عبدالعزیز صاحب سے اور جناب نے اپنے والد ماجد شاہ ولی اللہ صاحب سے نیز میں نے حافظ عبدالمنان صاحب وزیر آبادی سے سند حاصل کی، آپ نے سید نذیر حسین صاحب سے۔

مجھے اور میرے تمام احباب کو جو ان سے تلمذ کا واسطہ رکھتے ہیں۔ ان تمام احباب مذکورہ بالا کے متعلق یقین ہے کہ یہ سب کے سب امانت، دیانت میں قابلِ اطمینان تھے۔ یہی حال اس زمانہ کے لوگوں کا ہے جنہوں نے حدیثوں کو جمع کیا ہے۔

رواۃ پر جو ثقہ ضعیف ہونے کے فتوے لگائے گئے بلا سوچے سمجھے نہیں لگائے گئے بلکہ دیکھ کر اور تحقیق کر کے لگائے گئے ہیں۔ اگر ان میں اختلاف نہ ہو تو ان کے حکم پر ہم کو اطمینان ہو جاتا ہے۔ اگر اختلاف ہو تو اختلاف کی وجہ میں غور کرنا ہوتا ہے۔ اگر جرح واقعی اس قابل ہو کہ اس کا اعتبار کیا جائے تو جرح کرنے والے کا قول معتبر ہوگا ورنہ ثقہ کہنے والے کی بات قابلِ اعتبار ہوگی۔

پہلے پہل علمأ میں اس بارے میں اختلاف تھا کہ اہل بدعت کی روایت مقبول ہے یا نہیں، بعد میں یہ بات طے پائی کہ اہل بدعت اگر راست گو اور حافظہ قوی رکھتا ہو تو اس سے روایت لینے میں کوئی حرج نہیں بشرطیکہ بدعت کی طرف دعوت نہ دیتا ہو۔ نہ اس کی وہ روایت بدعت کی مؤید ہو۔

بعض جگہ کسی امام نے ایک ثقہ کو بعض حالات سے متاثر ہو کر مجروح ٹھہرایا ہوتا ہے (مگر ان باتوں کا پتہ لگانا ایک عالم کے لیے کوئی مشکل نہیں ہوتا۔) پس ایسی صورت میں اس کی جرح کا مقام معلوم کرنا کوئی مشکل نہیں ہوتا۔ مثلاً امام مالکؒ نے امام المغازی امام محمد بن اسحاق کو دجال کہا ہے مگر یہ کلمہ ان کا بعض باتوں سے متاثر ہونے کی بنا پر ہے جیسا کہ اسماء الرجال کی کتابوں سے معلوم ہوتا ہے۔ نفس الامر کے مطابق نہیں، یہی وجہ ہے کہ امام مالکؒ نے اس غلطی سے رجوع کیا ہے۔ محمد بن اسحاق کو تحفہ بھیجا۔ بس ایسی جرحیں جب ثابت ہو جائے کہ ان میں جذباتی تاثر کو دخل ہے یا محض مذہبی منافرت کی بنا پر ہیں۔ محدثین کے نزدیک ان کا کوئی اعتبار نہیں ہوتا۔

پس جرح و تعدیل کی کتابوں سے ایک سمجھ دار آدمی فائدہ اٹھا سکتا ہے۔ جس نے اساتذہ کی مجلس میں یہ باتیں سنی بھی ہوں اور ذہن صاف رکھتا ہو مگر جو شخص دینی علوم میں کسی استاذ کی تعلیم و تفہیم کا مرہون منت نہ ہو نہ ذہنی صفائی سے اس کو کچھ حصہ ملا ہو۔ وہ خواہ مخواہ ان عبارتوں کو دیکھ کر الجھن میں پڑ جائے گا۔ يُضِلُّ بِهٖ كَثِيرًا وَّيَهْدِي بِهٖ كَثِيرًا [1] اس کے ساتھ بہت کو گمراہ کرتا ہے (جو سمجھنا نہ چاہتے ہوں یا معاند ہوں) اور بہت کو ہدایت کرتا ہے (جو تحقیق کے عادی ہوں اور معاند نہ ہوں۔)

محدثین نے ثقہ کہنے میں صرف دیانت داری کا لحاظ نہیں رکھا۔

آج کل بعض لوگ یہ پراپیگنڈا کر رہے ہیں کہ محدثین نے ثقہ ہونے میں صرف دیانت داری کا لحاظ رکھا ہے۔ چنانچہ لکھتے ہیں :۔

"ایک شخص کا متقی پرہیزگار ہونا اس بات کے لیے مستلزم نہیں کہ اس کی یادداشت بھی اچھی ہو" [2]

یہ لوگ ایک حد تک معذور ہیں کیونکہ فن حدیث سے بالکل عاری ہیں۔ اس عدم واقفیت کے باوجود اس فن میں دخل بھی دینا چاہتے ہیں۔ پس ضروری ہے کہ اس قسم کی غلط باتیں کہیں کہ محدثین کے نزدیک ثقہ ہونے کے لیے صرف پرہیزگاری شرط ہے۔ اس پر بس نہیں بلکہ یہ بھی لکھا ہے :۔

"اگر یادداشت بھی درست ہو تو یہ ضروری نہیں کہ اس میں حقائق و معارف کے سمجھنے کی کماحقہ استعداد ہو" [3]

اس عبارت میں بھی جہالت ہی کی کرشمہ فرمائی ہے۔ کیونکہ اگر یادداشت کا درست ہونا حقائق و معارف کو سمجھنے کو مستلزم نہیں تو حقائق و معارف کے سمجھنے کے منافی بھی نہیں۔ یہ اعتراض اس وقت درست ہوتا جب محدثین روایت بالمعنی کے لیے صرف یادداشت کافی سمجھتے مگر یہ بات نہیں بلکہ محدثین نے روایت بالمعنی کے لیے یہ بھی شرط لگائی ہے کہ روایت بالمعنی کرنے والے کو اس قدر واقفیت ہونی چاہئے کہ اصل عبارت اور روایت بالمعنی کے الفاظ میں اختلاف اور اتفاق کو سمجھ سکے۔ اگر ایسا نہ ہو تو اس کو روایت بالمعنی کی اجازت نہیں۔ ایسے شخص کے لیے ضروری ہے کہ سنے ہوئے لفظ ہی بیان کرے۔

---

[1] بقرہ [2] مقام حدیث ۔ ج ۱ ص ۱۰۲ [3] ایضاً ص ۱۰۵